اردو شاعری میں معاشی مسائل کی پیش کش۔۔۔۔۔اجمالی جائزہ

The Representation of Financial Problems in Urdu Poetry: An Analysis

ڈاکٹر عابد سلیم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج پتوکی

ڈاکٹر محمد ریاض عابد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

ABSTRACT:

Literature is the reflection of any society. It represents the civilization, culture, rituals along with the political and historical circumstances, it brings to light the economic life of the individual living in that society. The Financial difficulties become the part of literature at individual and collective level. We can get an awareness about the economy and the economic conditions of a society by reading the literature produced by that society. The Urdu Poetry remarkably presents the economic problems of the society. From the development of Deccan to the financial devastation of Delhi and the financial problems of today are a mighty theme the Urdu Poetry. Jaffar Zattali, Meer Taqi Meer, Aatish, Ghalib and other classical poets have vastly highlighted the financial problems of that era in their poems. Nazir Akabarabadi presented the social problems of the common man in his poetry, he too presented the financial problems of his age. The Progressive Writers Movement poets made the financial problems of India an important theme of their poetry. Dr Iqbal criticized both the capitalism and the socialist systems because both exploit the worker. Fiaz Ahmad Faiz, Noon Meem Rashid, Majeed Amjad and other modern poets have presented the financial problems with stylistic beauty.

ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سماجی ترقی اور تنزلی کے تمام نشیب و فراز کسی بھی معاشرے کے ادب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ادب جہاں تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور سیاسی و تاریخی حالات کا عکاس ہوتا ہے وہاں معاشرے میں بسنے والے افراد کی معاشی زندگی کو بھی منظر عام پر لاتا ہے۔ معاشی حالات انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ادب کا حصہ بنتے ہیں۔ ہم کسی بھی معاشرے کے ادب کا مطالعہ کر کے اس کی معیشت اور معاشی حالات سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ معاشی طور پر مضبوط معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جہاں لوگ خوش مزاج، خوش ذوق اور خوش لباس ہوتے ہیں۔ اخلاقی اور طبی ہر دو لحاظ سے یہ معاشرہ صحت مند رجحانات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کمزور معیشت کا حامل معاشرہ اقدار و روایات کے ساتھ ساتھ اخلاقی سطح پر بھی شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جہاں لوگ فاقوں مر رہے ہوں وہاں اقدار اور اخلاقیات

-1

-2

بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کمزور اور مضبوط معیشت کے سماج پر اثرات کی ایک مثال دِلّی اور لکھنؤ کا معاشرہ ہے۔ ذیل کی شعری مثالوں سے اس معاشی تفاوت کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں ؎
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

(میرؔ)

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو ؎
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے، ہر اک کوچہ ہے عشرت کا
(بحرؔ)

ان مثالوں سے دِلّی اور لکھنؤ کے معاشی تفاوت کے ساتھ ساتھ معاشرے پر معاشی پس ماندگی کے اثرات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دلی کی قنوطیت اور لکھنؤ کی رجائیت میں بڑا حصہ ان کے معاشی حالات کا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا

کہ اردو شاعری میں میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ کے مزاجوں میں پایا جانے والا فرق جو کبھی "آہ" اور "واہ" اور کبھی ذیل کی شعری مثالوں سے واضح کیا جاتا ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ؎
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
(میر تقی میرؔ)

سوداؔ کی جو بالیں پہ اٹھا شور قیامت ؎
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
(سوداؔ)

بنیادی طور پر معیشت کی مضبوطی اور کمزوری کا فرق ہی ہے۔ سوداؔ نے میرؔ کی طرح غربت کا سامنا نہیں کیا اور نہ ہی سوداؔ کو تلاشِ معاش میں میرؔ جیسی مشکلات برداشت کرنا پڑیں۔ فکرِ معاش سے سوداؔ جس قدر آزاد تھے میرؔ اسی قدر اس کے اسیر تھے۔ لہٰذا دونوں استادانِ فن کی شاعری میں ان کی حقیقی زندگی کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ میرؔ کی مفلوک الحالی اور سوداؔ کی خوش حالی ان کی طبیعتوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھی بہت واضح ہے۔

جس طرح اردو شاعری نے ہر دور میں سیاست اور سماج کو اپنا موضوع بنایا ہے ویسے ہی معاشی حالات بھی ہماری شاعری کا بڑا موضوع ہیں۔ معاشی خوش حالی اور معاشی مفلوک الحالی کے اثرات سماج پر جس انداز میں مرتب ہوتے رہے ہیں اردو شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فکر معاش سے انسان کبھی بھی آزاد نہیں رہا۔ اپنے مالی حالات کی بہتری اور معیشت کی مضبوطی کے سلسلہ میں انسان جس قدر محنت کر سکتا ہے وہ کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص اسی دھن میں ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس کی مالی حیثیت مضبوط ہو جائے۔ ان سب معاملات کی اُردو شاعری میں بڑی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

بشنو بیان نوکری، جب گانٹھ ہوتی کھوکھری ؎
تب بھول جائے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
ہر صبح ڈھونڈیں چاکری، کوئی نہ پوچھے بات ری

سب قوم ڈھویں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے

کیسے رہیں ایمان سے، عاجز ہمیشہ نان سے

بیزار ہیں مہمان سے یہ نوکری کا خبط ہے

(۱)

"یہ نوکری کا خبط" فرخ سیر کا سکہ لکھ کر پھانسی پانے والے جعفر زٹلی کو ہے۔ اس پوری نظم سے اس دور کے معاشی حالات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ میر و سودا کے عہد کی شاعری بھی معاشی حالات کی عکاسی سے خالی نہیں ہے۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنے زمانے کی معیشت اور معاشی حالات کی عکاسی کرنے والوں میں ایک بڑا نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ نظیر کی شاعری عام آدمی کی زندگی سے عبارت ہے۔ انہوں نے جس انداز میں اپنے زمانے کی عوامی زندگی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور میں بھی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاش ہی تھا۔ معاشی زبوں حالی اور اس کے اثرات نظیر کی درج ذیل نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

"آٹا اور دال"، "آٹے دال کی فلاسفی"، "افلاس کا منظر"، "روٹی کی فلاسفی"، "چپاتی کی فلاسفی"، "مفلسی کی فلاسفی"، "کوڑی کی فلاسفی"، "دولت کی فلاسفی"، "روپے کی اہمیت"، "پیٹ کی فلاسفی"، وغیرہ۔ نظیر کی نظم "آٹے دال کی فلاسفی" میں ٹیپ کا مصرع آفاقی سچائی کا درجہ رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا ع

"پیٹ کی فلاسفی" کے درج ذیل مصرعے بھی نہ صرف نظیر کے عہد بلکہ ہر دور کے معاشی و سماجی حالات پر منطبق ہوتے ہیں۔

جو جس سے ہو سکا سو کیا پیٹ کے لیے ع

سب ڈھونڈتے پھرتے ہیں غذا پیٹ کے لیے ع

سب کر رہے ہیں فکر سدا پیٹ کے لیے ع

زاہد بھی مانگتا ہے دعا پیٹ کے لیے ع

" مخمس شہر آشوب"، میں آگرے کے معاشی حالات بڑی تفصیل سے قلم بند ہوئے ہیں۔

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات ؎
سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو رویئے اور کس کس کی کہیے بات
روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

(۲)

نظیر کی شاعری ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں انہوں نے معاشی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کی مالی مشکلات اور معاشی خستہ حالی کو بڑے جان دار الفاظ میں موضوع سخن بنایا ہے۔

غالب کے ہاں بھی ہمیں ان کے معاشی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ غالب ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار رہے۔ پنشن کی بحالی کی امید پر قرض لیتے رہے جسے واپس کرنے کی نوبت کم ہی آتی۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ قرض کی ادائیگی کے لیے مزید قرض اور پھر پنشن کا مقدمہ لے کر لکھنوٴ جانا بھی اپنے معاشی حالات میں بہتری لانے کی ایک کڑی تھی۔ ان معاشی مسائل کا تذکرہ غالب کی شاعری اور خطوط میں بارہا ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ؎
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(۳)

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسد ؎
ہم نے مانا کہ دلی میں رہے، کھاوینگے کیا؟

(۴)

غالبؔ نے اپنے معاشی مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے بادشاہ کے حضور جو درخواست پیش کی اس میں اپنی مالی مشکلات کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ میری تنخواہ ششماہی کے بجائے ہر مہینے دی جائے۔ اس طویل قطعہ میں غالب نے اپنے معاشی حالات بڑے دلکش پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ے کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں چہارم کا — ہو گیا ہے شریک ساہو کار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

(۵)

شاعری کے ساتھ ساتھ خطوط میں بھی غالب نے اپنے معاشی مصائب کا بارہا تذکرہ کیا ہے۔ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء کے خط میں علاؤالدین احمد خان علائی کو اپنی معاشی خستہ حالی ان الفاظ میں لکھ کر بھیجتے ہیں۔

"۔۔۔۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الوّر سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرہ سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کی کلکٹری (مراد خاندانی پنشن ہے جو کلکٹری کے خزانے سے ملتی تھی)، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہیے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا۔ گزارہ مشکل ہو گیا روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔(۶)

غالب کی شاعری اور نثر میں معیشت سے متعلق مسائل کے اس قدر بیان کو سامنے رکھتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے کہا ہے:

"غالب کے حزن کا بیشتر ماخذ مادی ہے۔ ان کا غم زیادہ تر "کھائیں گے کیا" کا غم ہے۔"(۷)

اقبال نے ۱۹۰۴ء میں منظر عام پر آنے والی اپنی تصنیف "علم الاقتصاد" میں معاشی افکار اور خیالات و نظریات کو بڑے منظم انداز میں پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی کمزور معیشت اور معاشی مسائل پر اقبال کی گہری نظر تھی۔ اس معاشی بدحالی کے خاتمے کا تذکرہ ہمیں اقبال کی تحریر و تقریر میں اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کے افراد کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ

انہیں اپنی مادی ضروریات کی تکمیل اور معاشی پس ماندگی کے خاتمے کے لیے اخلاقی حدود میں رہنا چاہیے کیوں کہ روحانیت گروی رکھ کر بہتر معاشی زندگی کا حصول سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے ؎
قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکرِ معاش

(۸)

ہندوستان کے مسلمانوں کی معیشت کے ساتھ ساتھ اقبال کی ''نگاہ تیز'' عالمی سطح پر ہونے والی معاشی تبدیلیوں پر بھی ہے۔ وہ بڑی معاشی طاقتوں کے کمزور معیشت کی حامل ریاستوں پر چڑھ دوڑنے کے سخت خلاف ہیں۔ اقبال کے نزدیک معاشی غلامی بھی اتنی ہی زہرناک ہے جتنا کسی فرد یا قوم کو عملاً غلام بنالینا۔ ضرب کلیم کی نظم ''ابی سینیا'' ایسی ہی صورت حال کی عکاس ہے۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال ؎
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گُرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

(۹)

اقبال مزدور کے استحصال کو کسی صورت برداشت نہیں کرتے۔ ایسا ہر معاشی نظام جس میں محنت کشوں کو ان کا حق نہ ملے اور سماجی و معاشی سطح پر ان کا استحصال ہو اقبال کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کو مزدور کے لیے اچھا سمجھتے ہیں اور نہ ہی وہ اشتراکیت کے حق میں ہیں کیونکہ دونوں نظاموں میں مزدور اور محنت کش طبقے کو نہ صرف ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ محنت کا ثمر بھی ان تک نہیں پہنچ پاتا۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی ؎
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

(۱۰)

اسی طرح اقبال اشتراکی نظام میں محنت کش طبقے کے ساتھ ہونے والے ظلم اور ناانصافی کی بھی مذمت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مزدور کے استحصال کا انداز وہی ہے مگر اب کی بار طریقہ بدل گیا ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(۱۱)

جدید دور میں انسان کے معاشی مسائل میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی کے باوجود معاشی مسائل میں اضافہ اور فی کس آمدنی میں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ برصغیر پاک وہند کے عوام جدید صنعتی و سائنسی انقلاب کے باوجود اس کے فیض سے محروم ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بعد اشتراکیت نے بھی مزدور طبقے کے لیے علمی اور نظریاتی سطح پر تو بہت کچھ کیا مگر زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ مزدوروں کے حقوق کی بات تو ضرور کی گئی مگر ان کے استحصال میں کمی نہ ہونے کے برابر ہے۔ جدید اردو شاعری جہاں مزدور اور محنت کش طبقے کی حمایت کے لیے علم بلند کرتی ہے وہاں ان کے مسائل کو بھی بڑے جان دار انداز میں پیش کرتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ

اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

(۱۲)

مجید امجد نے جدید اردو نظم کو اسلوب اور ہیت کے نئے تجربات سے روشناس کرایا۔ مجید امجد خود بھی محکمہ خوراک میں ملازم تھے۔ انہوں نے مزدوروں اور محنت کشوں کی زندگی اور مسائل کو بڑے خوب صورت انداز میں اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ غریب طبقے کے معاشی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ ان کے روٹی، کپڑے اور مکان کا ہوتا ہے۔ مجید امجد کے ہاں ان مسائل کے حوالے سے بہت خوب صورت نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی نظم "کمائی" سے ایک مثال دیکھیے۔

پھر جب دل کہتا ہے: "اے رے کرجوے! آج ہمارے لئے تم

کتنے کرمنڈل بھیجو گے امرت جل کے؟"

تب ایسے میں، کون یہ جانے، بندے

کون اس بھید کو پائے بندے!

کون یہ دیکھے لہو کی لہر کا سب روغن تو

اس بھوجن کا رس ہے

وہ بھوجن جو کوڑا کرکٹ ہے اور جس کو کتے بھی نہیں کھاتے (۱۳)

اس کے علاوہ مجید امجد کی نظمیں 'چولہا'، "بھکارن"، "گداگر"، "گوشت کی چادر"، "کہانی ایک ملک کی" اور "پنواڑی" بھی عوام کے معاشی حالات کی عکاس ہیں۔ جدید اردو نظم میں ن۔م۔راشد بھی ایک بڑا نام ہے۔ ان کے ہاں بھی ہیں عوام کی معیشت سے متعلق مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ملکی حدود سے نکل کر بین الاقوامی معاشی تبدیلیوں کا ذکر بڑے مفصل انداز میں کرتے ہیں جس کی ایک مثال ان کی نظم "تیل کے سوداگر" ہے۔

ترقی پسند شعراء کی اکثریت نے ہندوستانی عوام کی غربت، کسمپرسی، سماجی و معاشی استحصال اور بھوک کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان شعراء کے ہاں مزدور اور محنت کش ہیرو کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ مارکس اور لینن کے نظریات کے زیر اثر ہندوستانی شاعروں نے اس پسے ہوئے طبقے کے حقوق کی بات تو ضرور کی مگر عملی سطح پر یہ شاعری محض نعرہ بازی اور پراپیگنڈہ بن کر رہ گئی جس کی وجہ سے مزدوروں اور محنت کشوں کے مسائل کا حقیقی حل محض خواب بن کر رہ گیا۔ بہر حال شاعروں نے اپنے ضمیر کی آواز سنی

اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے ہندوستان کے غریبوں اور محنت کشوں کے استحصال کے خاتمے کی آواز بلند کی۔ ان شاعروں میں ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، کیفی اعظمی، احسان دانش، زہرا نگاہ، احمد فراز، حبیب جالب، صفدر میر، احمد مشتاق وغیرہ اہم ہیں۔ ان شعرا کے ہاں ہمیں برصغیر پاک وہند کے عوام کی سماجی اور معاشی زندگی سے وابستہ مسائل کی جان دار عکاسی نظر آتی ہے۔ معاشی خستہ حالی سے متعلق چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پیٹ ہی پیٹ مرا جسم ہے دل ہے نہ دماغ ؎
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ

(کیفی اعظمی)

لگ گیا اک مشین میں، میں بھی ؎
شہر میں لے کے آ گیا کوئی
ایسی مہنگائی ہے کہ چہرہ بھی
بیچ کے اپنا کھا گیا کوئی

(کیفی اعظمی)(۱۴)

دکھاوے کے لیے خوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر ؎
ہم اس دھرتی پہ ورنہ رزق کے چکر میں رہتے ہیں

جائز ہے کاروبار کی خاطر یہاں پہ سب ؎
چندہ کفن کے واسطے، میت کرائے پر

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح

ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا

(اقبال ساجد)(۱۵)

اب مری بیوی کی آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی

میرا ایک بچہ بھی مزدوری کے قابل ہو گیا

اک چھوٹے سے سیب کو کتنی قاشوں میں تقسیم کروں

کچھ بچوں کا باپ ہوں اشعر کچھ بچوں کا تایا ہوں

(علی مطہر اشعر)

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے

کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

(اسلم کولسری)

دن بھر تو بچوں کی خاطر میں مزدوری کرتا ہوں

رات کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے

میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

(تنویر سپرا)(۱۶)

اٹھا جو شور تو اہلِ ہوس نے گھبرا کر
زمین لیز پہ دے دی کسان بیچ دیا
یہی ہے بھوک کا عالم تو دیکھنا اک دن
کہ ہم نے دھوپ بھرا آسمان بیچ دیا

(احمد مشتاق)(۱۷)

ان چند شعری مثالوں سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارا شعری ادب ہمیشہ اپنے عہد کا ترجمان رہا ہے۔ انسان کے سماجی اور معاشی حالات انفرادی اور اجتماعی سطح پر موضوعِ سخن بنتے رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ میر جعفر زٹلی، ''کلیات میر جعفر زٹلی''، مرتبہ، ڈاکٹر نعیم احمد، ادبی اکادمی علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۳

۲۔ نظیر اکبر آبادی، ''کلیات نظیر اکبر آبادی'' (جلد دوم)، مرتبہ رانا خضر سلطان، بک ٹاک پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷

۳۔ غالب، اسد اللہ خان، ''دیوان غالب (نسخہ عرشی)''، مرتبہ، امتیاز علی خان عرشی، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۸

۴۔ ایضاً ص ۱۸۱

۵۔ ایضاً ص ۱۳۹،۱۳۸

۶۔ غالب، اسد اللہ خان، ''مجموعہ مکاتیب غالب''، مرتبین، پروفیسر، نذیر احمد، غلام رسول مہر، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۸

۷۔ صدیقی، رشید احمد، ''غالب کی شخصیت اور شاعری''، چوہدری اکیڈمی، لاہور، سن ندارد، ص ۴۷

۸۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۵۹۶

۹۔ ایضاً ص ۶۵۷

۱۰۔ ایضاً ص ۲۹۱،۲۹۲

۱۱۔ ایضاً ص ۳۷۴

۱۲۔ فیض احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد، ص ۷۰

۱۳۔ مجید امجد، ''کلیات مجید امجد''، مرتبہ، خواجہ محمد زکریا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۷۴

۱۴۔ عزیز حامد مدنی، ''جدید اردو شاعری'' (جلد دوم)، انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۱،۱۲۰

۱۵۔ طارق ہاشمی، ''اردو غزل۔ نئی تشکیل''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۷،۲۱۶،۲۱۵

۱۶۔ ایضاً ص ۳۴۹،۳۵۰

۱۷۔ احمد مشتاق، ''کلیات احمد مشتاق''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۸